© rasailojaraid.com



علم جامعہ نے بہت عمدہ تعزیتی تقریر فرمائی جس سے گھر کے لوگوں کو تلقین اور اطمینان حاصل ہوا پھر ایک ہفتہ کے بعد جب مدینہ اخبار بجنور آیا تو اس میں مولانا حافظ حفیظ الرحمٰن عمری کی تقریر تھی مضمون کا عنوان یہ تھا "مجاہد ملت حضرت حکیم فضل الرحمٰن صاحب مولائی کو عمدہ جانگاہ" مضمون کافی طویل تھا، آپ اُس وقت جامعہ میں زیرِ تعلیم تھے متعلم کا ایسا مضمون لکھنا ہمارے لئے باعث تحیر واستعجاب ہے۔ آخر میں جنوبی ہند کے ایک نوجوان فاضل وذہین اور فطین کا ذکر کرتا ہوں اُن کا نام مولوی خالد ناتعلی عمری ہے آپ میرے قدیم کرم دوست حضرت العلام مولانا غضنفر حسین صاحب شاکر ناتعلی علیہ الرحمۃ کے فرزند ہیں اور افضل العلما مولانا حافظ محمد یوسف کوکن عمری ایم۔اے کے ماموں زاد بھائی ہیں، آپ جامعہ عمر آباد سے فارغ ہو کر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم کے لئے گئے اور ہر سال اچھے نمبروں میں کامیاب ہوتے اتفاقاً دو سال قبل جب میں حج کے لئے گیا تو ان کے والد علیہ الرحمۃ نے میرے متعلق خط لکھا جہاز سے جدہ اُترا تو مجھ سے ملنے کے لئے جدہ آئے تھے مجھ سے مل کر میرا تمام کام بطور معلم شروع کیا، رہنے سہنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے کے تمام امور باحسن وجوہ انجام دئے میں نے ان کو غور سے دیکھا کہ علم وفضل کے علاوہ تمدن اور معاشرت میں بھی کمال حاصل ہے، میں نے ان سے کہا کہ عمر آباد تشریف لائیے انھوں نے کہا کہ میرا آخری امتحان باقی ہے اس سے فراغت کے بعد حاضر ہوں گا جب واپس آیا تو اپنے محبِ قدیم مولانا غضنفر حسین صاحب ناتعلی مرحوم سے عرض کیا کہ آپ کے فرزند ارجمند مولوی خالد ناتعلی سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مجھے بہت آرام ملا تھا بہت قابل اور باکمال نوجوان ہیں امتحان میں ان کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہوں، الٰہ العالمین ان کو کامیاب وفائز المرام فرمائے، یہ سُن کر وہ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں، جامعہ دارالسلام ۱۹۲۴ء میں قائم ہوا ہے پہلے اس کے مدرس مولانا شاکر صاحب مقرر ہوئے تھے اُس وقت سے جولائی ۱۹۶۶ء تک برابر درس دیتے رہے یعنی ۴۳ سال مدرس رہے اتنی طویل مدت تک ایک جگہ مدرس رہنا نادر ہے آپ سخت بیمار ہوگئے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اور ہسپتال میں انتقال ہوا ان کے صاحبزادے مولانا خالد صاحب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں آخری امتحان میں بہت عمدگی کے ساتھ کامیاب ہوتے والد کے انتقال کی اطلاع ملی تو فوراً چلے آئے، اب چار مہینہ سے عمر آباد میں اقامت پذیر ہیں۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے ایک دو اور فاضل اور ذہین و فطین عالموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ محب محترم مولانا عبدالرحمٰن خاں مالوری حماد مدرس جامعہ دارالسلام عمر آباد کے برادر خورد حبیب اللہ خاں جب دارالسلام عمر آباد سے فارغ التحصیل ہوتے تو لکھنؤ جاکر ندوۃ العلماء میں تعلیم پذیر ہوتے وہاں بھی بڑی عمدگی کے ساتھ تعلیم پائی اور درجہ اول میں کامیاب ہوئے کامیاب ہوتے ہی انھوں نے اپنے بھائی مولانا حماد صاحب کو خط لکھا کہ میں ندوۃ العلماء سے تو فارغ التحصیل ہوگیا ہوں اب دلی تمنا ہے کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کروں ازراہ کرم مولانا سید ابوالحسن ندوی ناظم جامعہ کو خط لکھئے تاکہ وہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں میرے داخلہ کے لئے سفارش فرمادیں اتفاق سے میں عمر آباد گیا تھا تو مولانا حماد صاحب نے اپنے بھائی حبیب اللہ خاں کا خط دکھایا میں نے کہا کہ آپ ضرور ناظم ندوۃ العلماء کو خط لکھئے گا اور میں بھی ان کو خط لکھوں گا کیوں کہ حضرۃ العلام مولانا سید ابوالحسن علی ناظم جامعہ ندوۃ العلماء میرے استاد زادے ہیں یقین ہے وہ میرے خط پر ضرور توجہ فرمائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سفارش فرمائی وہاں سے داخلہ کے لئے اجازت مل گئی لیکن حکومتِ ہند کی جانب سے پاسپورٹ نہیں مل سکا میں نے حضرت العلام مخدومی مطاعی مولانا مفتی محمد عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہ العالی کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ ازراہ کرم حبیب اللہ خاں عمری ندوی کے لئے مدینہ منورہ جانے کے لئے پاسپورٹ دلوایئے اور پاسپورٹ دینے والے کو سمجھایئے کہ حبیب اللہ خاں عمری ندوی مذہبی تعلیم پانے کے لئے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ جارہے ہیں، وہ کوئی سیاسی آدمی نہیں ہیں۔ اسی طرح ایک خط میں نے اپنے اخ المکرم زبدۃ الحکما مولانا حکیم کبیرالدین صاحب کی خدمت میں لکھا کہ آپ بھی موقع



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



حبیب اللہ خاں عمری ندوی کے لئے مدینہ منورہ جانے کے لئے پاسپورٹ کی کوشش کریں اسی کے ساتھ اپنے قدیم دوست بہر چند کھنہ مرکزی وزیر کو بھی لکھا کہ آپ ضرور حبیب اللہ خاں عمری ندوی کے لئے پاسپورٹ کی سعی کریں ان تینوں خطوط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو پاسپورٹ مل گیا اور وہ مدینہ منورہ چلے گئے سنا ہے کہ بہت شوق و ذوق سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دوسرے میرے دوست محترم مولانا عبدالرحمٰن صاحب مالوری حمآد مدرس جامعہ دارالسلام عمرآباد کے برادر خورد ہیں جو بہت ہی خورد سال ہیں نام مولوی رضاء اللہ خاں عمری ہے اور افضل العلماء ہیں، جامعہ دارالسلام عمرآباد سے فارغ ہونے کے بعد مرکزی دارالعلوم بنارس میں تعلیم شروع کی، وہاں سے بھی اچھے نمبروں میں فارغ التحصیل ہو گئے ہیں اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل ہونے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔

جنوبی ہند میں علم و فضل کا یہ اجمالی بیان ہے مستقبل میں یقین ہے یہ میدان وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا، ـــــ اور شمالی ہند اس خطے کے اصحاب علم و فضل پر رشک کرنے لگے گا۔

---

مجلس ترقی ادب کا سہ ماہی تحقیقی و طبی مجلہ

صحیفہ

زیر ادارت ڈاکٹر وحید قریشی

تازہ شمارہ آگیا ہے

خاص خاص مندرجات

حسنؔ لکھنوی کا نایاب دیوان — محمد سخاوت مرزا
انیسویں صدی کا جھنگ — مسکین حجازی
خلجی اور تغلق دور کے چند گمنام فارسی شعراء — ڈاکٹر نذیر احمد
قیمت فی شمارہ = ڈیڑھ روپیہ — سالانہ چندہ - چھ روپے

مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



# وسوا بھارتی شانتی نکیتن میں ایک سیمینار

سعید احمد اکبر آبادی

ہمارے ملک کی چار مرکزی یونیورسٹیاں جن میں علی گڈھ۔ دہلی اور بنارس شامل ہیں اُن میں چوتھی یونیورسٹی وسوا بھارتی شانتی نکیتن ہے جو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی قائم کردہ اور ان کے فلسفیانہ وشاعرانہ تخیل کی آئینہ دار ہے گزشتہ ماہ نومبر میں اس یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے زیر اہتمام ایک کل ہند سیمینار منعقد ہوا جو ۱۷۔۱۸۔ اور ۱۹ رنومبر تین دن جاری رہا اس سیمینار کا موضوع تھا THREE ATTITUDES OF RELIGION, GAYAN, KARMA, BHAGTI. (مذہب کے تین طرز گیان۔ کرما اور بھگتی) موضوع دلچسپ اور اہم تھا اور کلکتہ میں دس برس قیام کرنے کے باوجود کبھی وسوا بھارتی دیکھنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا اس لئے ستمبر میں جب مجھ کو ذاتی طور پر پروفیسر سین گپتا صدر شعبۂ فلسفہ کا دعوت نامہ ملا تو میں نے فوراً ہامی بھرلی اور سیمینار میں ایک مقالہ پڑھنے کا وعدہ کرلیا۔ چنانچہ ۱۴ رنومبر کی شب میں ایرانڈیا ایکسپریس سے روانہ ہوا ۱۶ رکو صبح کے ۸ ½ بجے کے قریب بولپور اسٹیشن (جو پٹنہ سے ہاوڑہ جانے والی لائن اور بردوان سے تین چار سٹیشنوں کے فاصلہ پر واقع ہے) پر ٹرین پہنچی تو یونیورسٹی کے چند طلبہ نے استقبال کیا ان کے ساتھ ایک جیپ میں یونیورسٹی کے انٹرنیشنل مہمان خانہ آیا اور ایک کمرہ جو پہلے سے میرے لئے مخصوص کردیا گیا تھا اس میں فروکش ہوگیا۔ سیمینار کل سے شروع ہوگا اس لئے پھر فرصت ملی تو یونیورسٹی کو آج ہی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دیکھ لینا چاہیئے۔ نہا دھو۔ کپڑے بدل کر اور چائے سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل ہی میں پروگرام بنا کر بیٹھا ہی تھا کہ اتنے میں مجھی ڈاکٹر عبدالحق انصاری جو یہاں شعبۂ فلسفہ میں ہی ریڈر ہیں اور ابھی دو برس ہوئے کہ علی گڑھ سے وہاں منتقل ہوئے ہیں۔ تشریف لے آتے یہ اسٹیشن بھی پہنچے تھے لیکن ذرا دیر سے اس لئے میں ان کو نہیں مل سکا تھا۔ بہرحال بہت عرصہ کے بعد اب ان سے ملاقات کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ موصوف کی معیت میں آج کا دن یہاں کے دوست احباب سے ملنے ملانے اور یونیورسٹی کے دیکھنے میں صرف ہوا۔ دوسرے دن یعنی ۱۱ر نومبر کو صبح کے آٹھ بجے یونیورسٹی کی ایک بلڈنگ میں جو " چینا بھون " کہلاتی ہے (کیوں کہ یہاں چین کی زبان۔ مذہب فلسفہ اور کلچر کی تعلیم اور اس پر ریسرچ کی جاتی ہے) سیمینار کا افتتاح ہوا۔ نشست دری پر تھی۔ میز کرسی کا کہیں نام نشان نہیں تھا اور نہ کسی اور قسم کی کوئی آرائش تھی۔ ہال میں سامنے کی طرف کونہ میں مستطیل شکل کا ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس چبوترہ پر بھی دری اور اس پر سفید چادر بچھی ہے اور کنارہ پر کرسی کے سے گدّے (CUSHION) برابر برابر رکھے ہوتے ہیں۔ بس یہ یہاں کا ڈائس ہے مجلس کا صدر اور اس کے ساتھ اور دو چار آدمی انھیں گدوں پر نیچے پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

سیمینار میں اکیس ۲۱ یونیورسٹیوں کے تیس نمائندے شریک تھے۔ خود وسوا بھارتی کے نمائندے اس تعداد سے الگ ہیں۔ سیمینار روزانہ دو وقت ہوتا تھا۔ صبح آٹھ بجے سے (درمیان میں کافی کے لئے آدھ گھنٹہ کے وقفہ سے) بارہ بجے تک اور سہ پہر میں ڈھائی بجے سے ساڑھے چار بجے تک اس کے علاوہ مغرب کے بعد ۶½ سے ۸ بجے تک اجتماعی بحث (GROUP DISCUSSION) کا پروگرام ہوتا تھا جس میں آج کے دن جو مسائل زیر بحث آئے تھے ان پر شعبۂ فلسفہ کی عمارت میں ایک گول میز کے ارد گرد بیٹھ کر مزید گفتگو ہوتی تھی۔ سیمینار کی ترتیب یہ تھی کہ ایک صاحب مقالہ پڑھیں گے اور ان پر دو شخص تبصرہ (COMMENT) کریں گے جن میں سے ایک مبصر خود وسوا بھارتی کا ہوگا اور دوسرا باہر کا۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



یہ سب کچھ جب ہو جائے گا تو اب مقالہ کے موضوع پر صدر کی جانب سے عام بحث
اعلان ہوگا " جو حضرات اس میں شریک ہونا چاہیں گے وہ باری باری سے اس پر اظ
خیال کریں گے۔ آخر میں صاحب مقالہ تقریر کرے گا اور اس میں ان اعتراضات یا
وشبہات کا جواب دے گا جو اس کے مقالہ پر کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد صدر کی تق
ہوگی جس میں وہ اس نشست کی کارروائی پر تبصرہ کرے گا

اس وقت افتتاح کی مجلس کے صدر پروفیسر بی۔ بی سین پرنسپل ودیا بھون
اور افتتاح راہندر بھارتی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر ایچ۔ بنرجی کرنے والے
ٹھیک آٹھ بجے تھے کہ ہال میں چند لڑکیاں داخل ہوئیں اور انھوں نے پہلے تو ڈائس
جو حضرات بیٹھے تھے ان کی پیشانی پر صندل لگایا اور اس کے بعد خدا کی حمد میں لکھا
ڈاکٹر ٹیگور کا ایک گیت جو اس یونیورسٹی کا ترانہ ہے۔ گایا۔ اور اب پروفیسر سین
نے ایک رپورٹ پڑھی جو ان کے ادارہ (فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کا مرکز) کی گذ
چار ماہ کی سرگرمیوں پر مشتمل تھی اور جس میں سیمینار کے مقصد اور اس کے موضوع کی اہم
پر گفتگو کرنے کے بعد سیمینار کے شرکار۔ منتظمین اور صدر وغیرہم کا رسمی شکریہ ادا کیا گیا
اس کے بعد صدر نے تقریر کی اور پھر مسٹر بنرجی نے افتتاح کیا۔ مسٹر بنرجی ایک یونیور
کے وائس چانسلر ہی نہیں ہیں بلکہ مذہب اور فلسفہ کے بہت بڑے عالم اور مصنف
بھی ہیں اس لئے انھوں نے افتتاحی تقریر میں بتایا کہ ہندو مذہب اور فلسفہ میں گیان
کرما اور بھگتی کا عہد بعہد کیا تصور رہا ہے اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں اور کیوں ہو
ہیں۔ یہ تقریر کیا۔ ایک اچھا خاصہ پراز معلومات لکچر تھا۔

تقریر کے اختتام پر کافی یا چائے کے لئے آدھ گھنٹہ کا وقفہ ہوا اور اب سیمینار باقا
شروع ہو گیا جس میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے۔

۱۷ر نومبر صبح : (۱) "ہندوازم کے چند بنیادی تصورات" پروفیسر گوپال



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سے علاوہ یوسف حسین خاں صاحب نے اپنے بڑے بھائی کو۔ رشید احمد صاحب صدیقی نے اپنے مرشدہ کو اور محمد مجیب صاحب نے اپنے دیرینہ رفیق کار اور ساتھی کو الگ الگ مقالات کی صورت میں خراج عقیدت و ارادت پیش کیا ہے۔ بہرحال بحیثیت مجموعی علمی، ادبی اور تحقیقی اعتبار سے یہ کتاب بڑے اہم اور قابل قدر مضامین و مقالات پر مشتمل ہے۔ ہر صاحبِ ذوق کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

نذر ڈاکٹر ذاکر حسین تقطیع متوسط ضخامت ۱۱۵ صفحات کاغذ اور ٹائپ اعلیٰ مذکورہ بالا پتہ سے ملے گی۔ مگر قیمت مذکور نہیں ہے۔

یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو انگریزی مضامین و مقالات کے لئے مخصوص ہے اس میں اکتیس ۳۱ چھوٹے بڑے مضامین شامل ہیں۔ موضوع کوئی خاص نہیں ہے۔

یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو انگریزی مضامین و مقالات کے لئے مخصوص ہے اس میں اکتیس ۳۱ چھوٹے بڑے مضامین شامل ہیں۔ موضوع کوئی خاص نہیں ہے۔ شعر و ادب۔ سیاست و مذہب تاریخ و فلسفہ۔ قانون و فنون لطیفہ۔ معاشیات و نفسیات ان میں سے ہر ایک پر مضمون ہیں پھر لکھنے والوں میں ہند کے مشاہیر اہل علم کے ساتھ بیرون ہند کے نامور علما اور محققین بھی ہیں مضامین مجموعی طور پر سب ہی بلند پایہ اور لائق مطالعہ ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین کا مقالہ " ہندوستانی روح کا بحران " انگریزی اور اردو دونوں میں ہے اس لطفِ خاص کی مصلحت سمجھ میں نہیں آئی۔ بہرحال حسب ذیل مضامین خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں۔ ابتدائی خلفائے بنی عباس کے شاہی القاب۔ برنارڈ لوئیس ہندوستان سے متعلق یونانی اور لاطینی ذخیرۂ معلومات۔ روڈو روشر۔ دلدار بیگم آغاچہ کا حسب نسب اور ابتدائی حالات۔ زیڈ اے۔ ڈیسائی۔ ابوالفضل بحیثیت مورخ کے۔ خلیق احمد نظامی۔ خلیج فارس میں سلطان (ٹیپو) کی تجارتی سرگرمیاں۔ محب الحسن۔ عرب اور کیپ آف گڈ ہوپ کا چکر مقبول احمد۔ عہد جدید میں اسلامی قدریں۔ مونٹگمری واٹ۔ اعجاز خسروی۔ سید حسن عسکری۔ خط و کتابت کے ذریعہ اجازت روایت اے۔ جے۔ آربیری۔ عبرانی اور عربی میں جمع مکسر اور جمع سالم کی صورتیں جی آر۔ ڈرائیور۔ تقویم سن ہجری و عیسوی کا تضاد۔ اسحٰق النبی علوی۔ ابن ابی عون۔ عبدالمعید خان۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اور جو معلومات مہینوں ایک ہی مضمون کا مسلسل مطالعہ کرنے کے بعد بھی حاصل ہو سکتے ہیں وہ چند گھنٹوں میں حاصل ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ ابھی معلوم ہوا میرے مقالہ کا عنوان تھا "گیان، کرم اور بھگتی اسلام کے نقطۂ نظر سے" مقالہ انگریزی میں تھا اور میرے لئے کسی ایک زبان میں مضمون لکھنے کے بعد اُس کا کسی اور زبان میں ترجمہ کرنا سخت دشوار ہے۔ اس لئے قارئین برہان کی اُس سے ضیافت نہ کر سکنے کی مجبوری ہے البتہ میں نے اُس میں جو کچھ کہا تھا اُس کا حاصل یہ ہے

"ہندو مذہب اور فلسفہ میں جن چیزوں کو گیان، کرما اور بھگتی کہا جاتا ہے اسلام میں ان کے بالمقابل جو الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں وہ علی الترتیب معرفت، مکافاتِ عمل یا جزا اور عشق الٰہی ہیں لیکن دونوں کے تصور اور تعریف میں بہت بڑا فرق ہے۔

جہاں تک ہندو مذہب اور فلسفہ کا تعلق ہے۔ اگرچہ جزئی تشریحات اور تفصیلات میں اپنشد اور گیتا باہم مختلف ہیں۔ تاہم اتنی بات مشترک ہے کہ گیان کے معنی ہیں انسان کو خدا کا علم حاصل ہونا اور جب یہ علم حاصل ہوتا ہے تو بندہ بندہ نہیں رہتا بلکہ وہ خدا کا ایک جز اور اُس کی خدائی میں شریک ہو جاتا ہے اسی سے وحدۃ الوجود کا عقیدہ پیدا ہوا لیکن اس کے برخلاف اسلام میں معرفت کا جو تصور ہے وہ یہ ہے کہ علم کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک حصولی جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے اور دوسری حضوری اس میں عالم اور معلوم کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور شَے کا ادراک براہِ راست ہوتا ہے صوفیائے کرام جس چیز کو معرفت کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کو خدا کی ذات اور صفات کا علم حضوری یعنی براہ راست اور بغیر کسی واسطہ کے ہو۔ ایک انسان کو جب معرفتِ خداوندی کی یہ دولت و سعادت حاصل ہوتی ہے تو وہ حسن ذات اور تجلیاتِ صفات کی جلوہ باریوں میں اس درجہ محصور ہو جاتا ہے کہ اسے خود اپنا وجود کہیں نظر نہیں آتا اور یہی فنا کا مقام ہے لیکن بہرحال بندہ بندہ رہتا ہے اور خدا خدا۔ جد کبھی معبود۔ مخلوق خالق اور مربوب کبھی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مرتب نہیں ہو سکتا اور اس بنا پر ایک انسان روحانی کمالات کے خواہ کیسے ہی اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے بہرحال اسلامی شریعت کے احکام سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

گیان اور معرفت میں جو فرق ہے اسی درجہ کا فرق کرم اور جزا میں ہے۔ یہ عقیدہ تو صرف اسلام اور ہندو مذہب میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب میں مشترک ہے کہ ہر عمل کا ایک اثر اور نتیجہ ہوتا ہے۔ اچھے عمل کا اچھا اور برے عمل کا برا۔ چوں کہ مذہب کی بنیاد یہی عقیدہ ہے اس بنا پر قرآن نے بار بار اور بڑی قوت و شدت کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے، لیکن اب سوال یہ ہے کہ عمل کے بدلہ کی صورت کیا ہوگی؟ بس یہ وہ مقام ہے جہاں اسلام ہندو مذہب سے الگ ہو جاتا ہے۔ ہندو مذہب میں عمل کے بدلہ کی صورت تناسخ یا آواگون ہے اور اسلام کے نزدیک عمل کا بدلہ اسی وقت ملے گا جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی اور پھر حشر و نشر اور حساب و کتاب ہوگا اور مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْن کی طرف سے کوئی حکم صادر ہوگا۔ اسلام اور ہندو مذہب میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ اسلام میں توبہ استغفار وغیرہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے انسان کے گناہ دھل جاتے ہیں اور وہ آخرت کی پکڑ سے بچ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہندو مذہب میں توبہ وغیرہا کا کوئی مقام نہیں۔

اب لیجئے مکتی اور عشق الٰہی کو اپنشدوں کے بیان کے مطابق اس کائنات کی اصل اول (FIRST PRINCIPLE) کے علم یعنی گیان (عرفان) کے ذریعہ سے ہی نجات حاصل کی جا سکتی ہے گیتا سے اس متن کی شرح یہ معلوم ہوتی ہے کہ مذکورۂ بالا "اصل اول" "خدا" ہے اس بنا پر نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کا عرفان اور علم ہی نجات کا ذریعہ ہے۔ گیتا کے نقطۂ نظر سے ایک انسان کو آواگون کے چکر سے نجات (مکتی) اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ خدا کو حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن خدا کا یہ تصور اپنشدوں کے "اصل اول" کے غیر شخصی (IMPERSONAL IDEA OF THE FIRST PRINCIPLE) سے بہت مختلف ہے۔ یہ بھی کسی غیر شخصی خدا کا علم و عرفان سخت مشکل کام ہے ان دشواریوں کو گیتا نے واضح طور سے



© rasailojaraid.com

تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ گیتا کے بیان کے مطابق عام انسانوں کے لیے نجات حاصل کرنے کا جذباتی طریقہ زیادہ آسان اور مناسب ہے اور یہی چیز ہے جسے گیتا نے بھگتی محبت یا عشق الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں تک مطلق عشق الٰہی کا تعلق ہے۔ اسلام اور گیتا دونوں اس معاملہ میں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر دونوں اس نقطہ پر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں کہ گیتا کے تصور میں خدا کے ساتھ جذباتی محبت اور عشق ہی سب کچھ اور نجات کا ذریعہ ہے۔ اب عمل کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اس کے برعکس اسلام میں نجات کا ذریعہ عمل ہے اور عشق خداوندی تعطل کا نام نہیں۔

یہ ہے مختصر خلاصہ میرے مقالہ کا۔ داعی سیمینار نے میرے ساتھ پروفیسر ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی۔ کلکتہ کو بھی مدعو کیا تھا اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ اسلام پر مقالہ میرا ہوگا اور ڈاکٹر صاحب تبصرہ کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے دعوت نامہ قبول بھی کر لیا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیا اسباب پیش آئے کہ وقت کے وقت معذرت لکھ بھیجی۔ اب ادھر سے مایوسی ہوئی تو پروفیسر سین گپتا نے ایک خاتون سے درخواست کی کہ وہ میرے مقالہ پر تبصرہ کریں۔ موصوفہ نے فوراً ہامی بھر لی۔ چنانچہ جس روز میں یہاں پہنچا ہوں اسی روز وہ بھی پہنچ گئی تھیں اور مغرب کے بعد میرے کمرہ میں آکر مجھ سے مقالہ کی کاپی لے گئی تھیں تاکہ وہ اسے پڑھ کر اپنا تبصرہ لکھ لیں۔ یہ خاتون ڈاکٹر مسز سوبھا رانی باسو ہیں جو بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ میں ریڈر ہیں۔ انھوں نے اسلامی تصوف پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈرہم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے۔ اور شیخ فریدالدین عطار کے منطق الطیر کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ یہ سود ان کے ساتھ تھا اس لئے میں نے خود بھی دیکھا ہے۔ ورنہ ان کا بیان یہ ہے کہ وہ ۱۹۵۲ء سے حضرت شیخ اور ان کے تصوف کا مطالعہ کر رہی ہیں اور اب تک اس سلسلہ میں چار ہزار صفحات لکھ چکی ہیں۔

بہرحال اب جناب صدر نے مسز سوبھا رانی باسو کا نام پکارا اور موصوفہ نے کھڑے

© rasailojaraid.com



ایس حسن نے بھی میرے مقالہ پر تبصرہ فرمایا۔ یہ تبصرہ کیا تھا؟ اسلامی تصوف پر ایک مستقل تقریر تھی۔ میرے مقالہ کے جو بنیادی عناصر و اجزا تھے۔ محترم نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ البتہ مقالہ میں دو تین جگہ تصوف اور صوفیا کا تذکرہ کیا تھا بس اسے لے اڑیں اور اسی مناسبت سے تصوف پر ایک لکچر دے ڈالا۔ چنانچہ حاضرین جلسہ نے اسے محسوس کیا اور پھر بعد میں جب عام بحث ہوئی تو کچھ لوگوں نے اس طرف اشارہ بھی کیا۔ مسٹر مسو بھارتی کے علاوہ دوسرے مبصر (COMMENTATOR) ڈاکٹر سعید الحق انصاری تھے۔ موصوف نے شروع میں کہا کہ مجھے مقالہ کے کسی جزء سے اختلاف نہیں ہے البتہ اس میں بعض حقائق کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے میں ان کی وضاحت کروں گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ایسا ہی کیا بھی! ان کا تبصرہ بھی ختم ہو گیا تو اب اس پر عام بحث شروع ہو گئی۔ اس بحث میں جن حضرات نے حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں :-

(۱) ڈاکٹر جی۔ ڈی۔ جہا بھاگلپور۔

(۲) پروفیسر باسبر انیم۔ مدراس یونیورسٹی

(۳) پروفیسر پانڈے دہلی یونیورسٹی

(۴) پروفیسر مورتی آندھرا یونیورسٹی

(۵) پروفیسر ایس۔ کے۔ گھوش۔ وِسوا بھارتی۔

یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ انھوں نے جو کچھ کہا وہ اوٹ پٹانگ نہیں تھا۔ بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسلام سے کچھ نہ کچھ واقف ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات نے تو مقالہ کے بعض بیانات پر اعتراضات کئے تھے اور بعض نے بعض چیزوں کی صرف وضاحت چاہی تھی۔

اب آخر میں مجھے ان سب کا جواب دینا تھا۔ لیکن چونکہ وقت ختم ہو گیا تھا اس لئے مجھ سے وعدہ کر لیا گیا کہ جب ہم سب لوگ گروپ ڈسکشن کے لئے جمع ہوں میں اس وقت جواب دوں گا۔ اس کے بعد پروفیسر محمد مجیب نے عنایت پر مقالہ پڑھا تھا ان کا



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



معاملہ بھی یہی تھا۔ چنانچہ شام کو ۶ $\frac{1}{2}$ بجے ہم شعبۂ فلسفہ کی عمارت میں جمع ہو گئے اور پہلے پروفیسر کارمن نے اور پھر میں نے اپنے اپنے مقالہ پر بحث کا جواب دیا۔ اس طرح یہ نشست دو گھنٹہ میں یعنی ۸ $\frac{1}{2}$ بجے ختم ہوئی۔

سیمینار کی روداد تو ختم ہو گئی اب کچھ وسوا بھارتی کا حال بھی سن لیجئے۔ وسوا بھارتی ہندوستان کی بہت وسیع اور بین الاقوامی شہرت کی ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہے۔ یوں پڑھانے کو تو سب کچھ ہی پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن فلسفہ و مذہب اور فنون لطیفہ اس کے خاص مضامین ہیں۔ یہ یونیورسٹی اپنے بانی ڈاکٹر ٹیگور کے تخیل اور اُن کی آئیڈیالوجی کی آئینہ دار ہے۔ موصوف ایشیا کے بلند پایہ شاعر، فلسفی اور صوفی مشرب مفکر اور بزرگ تھے۔ ان کی تاکید تھی کہ یونیورسٹی میں ہمیشہ تین باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ ایک سادگی کا دوسرے خاکساری کا اور تیسرے فطرت سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کا! یونیورسٹی ۱۹۲۱ء میں قائم ہوئی تھی اور آج اُس کی عمارتیں بارہ میل مربع کے وسیع رقبہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اس تقریباً نصف صدی کی مدت میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی لیکن باایں ہمہ وسوا بھارتی اپنی آئیڈیالوجی اور اس کے عملی مظاہر کے اعتبار سے آج بھی ٹھیک اسی مقام پر ہے جہاں پہلے دن تھی۔ چنانچہ سادگی اور خاکساری کا یہ عالم ہے کہ آپ کو وائس چانسلر۔ اساتذہ۔ طلبا اور اعلیٰ عہدہ داروں سے لے کر چپراسیوں تک سب ایک ہی لباس اور ایک ہی وضع قطع میں نظر آئیں گے۔ یعنی بدن پر ایک کرتا اور دھوتی (عموماً کھدر کی) اور پاؤں میں ایک چپل۔ سردی ہوئی تو اونی چادر اور سوئٹر۔ سر ننگا۔ بڑے سے بڑا پروفیسر پیدل پھرتا ہے یا رکشا میں بیٹھتا ہے۔ پوری یونیورسٹی میں صرف دو موٹر کاریں ہیں۔ ایک وائس چانسلر کی اور ایک کسی اور کی۔ ڈاکٹر ٹیگور کی تاکید تھی کہ عمارتیں اونچی اونچی اور پختہ نہ بنائی جائیں۔ کیوں کہ یہ خاکساری کے خلاف ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی میں جتنی عمارتیں ہیں سب سادہ۔ چھوٹی اور مشرقی وضع کی ہیں۔ کسی بلڈنگ پر جرمنی اور فرانس کی چھاپ ہے اور نہ امریکہ اور اٹلی کی۔ کلاسیں عام طور پر بڑے بڑے گھنے اور وسیع درختوں کے نیچے ہوتی ہیں جن میں



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



رہنے کی منڈیریں بنی ہوئی ہیں لڑکے اور لڑکیاں سب اس پر بیٹھ جاتے ہیں یا ہر طالب علم اپنے ساتھ ایک رومال لے کر آتا ہے اس کو بچھا کر زمین پر ہی پالتی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بعض کلاسیں کمروں میں ہوتی بھی ہیں تو دری یا چٹائی کے فرش پر۔ دفتروں میں۔ ڈائننگ ہالوں اور مہمان خانوں میں میز کرسیاں ہیں مگر بہت سادہ اور معمولی بعض لڑکوں اور لڑکیوں کو ننگے پاؤں پھرتے دیکھا۔ سادگی کے ساتھ صفائی کا بڑا اہتمام ہے۔

سیمینار کے سلسلے میں پینتیس کے قریب باہر کے مہمان آئے ہوئے تھے اور ان میں ایک امریکن اور ایک یوروپین بھی تھے لیکن کیا مجال کہ ان کے لئے الگ کوئی انتظام ہو جس مشرقی انداز پر ہم معمولی میز۔ کرسی اور سونے کے لئے تخت کے ساتھ ہم رہتے تھے۔ اسی طرح وہ بھی رہتے تھے اور اگرچہ مچھلی اور گوشت دونوں وقت ملتے تھے لیکن ہندوستانی طرز کے پکے ہوئے جو کھاتے ہم کھاتے تھے اور جس ہندوستانی طریقہ پر یعنی ایک تھال میں اور کانٹے چھری کے بغیر اسی طرح ان کو بھی کھانا پڑتا تھا۔

یونیورسٹی کو اپنی تہذیب اور قدیم روایات کا اس درجہ پاس اور لحاظ ہے کہ اب تک وہاں تعلیم بجائے ایک وقت کے دو وقت ہوتی ہے۔ سیمینار کے دنوں میں صبح ۷ سے گیارہ بجے تک اور سہ پہر میں دو سے چار تک۔ ہفتہ وار تعطیل بجائے اتوار کے بدھ کے دن ہوتی ہے۔ کیوں کہ اسی دن ڈاکٹر ٹیگور کو چالیس دن کے مراقبہ اور عبادت کے بعد عرفانِ روحانی ہوا تھا۔ یونیورسٹی کے احاطہ میں مورتی پوجا کرنا منع ہے۔ کیوں کہ ڈاکٹر ٹیگور اور ان کا پورا خاندان برہمو سماج سے تعلق رکھتا تھا جس کے بانی راجہ رام موہن رائے تھے اور یہ فرقہ موحد ہوتا ہے۔ اسی طرح شراب نوشی اور سگریٹ نوشی قانوناً ممنوع ہے۔ یونیورسٹی کے رستوران تک میں No Smoking کا نوٹس لگا ہوا ہے۔ ہوٹلوں میں کھانا کھانے کے بعد خواہ کوئی طالب علم ہو یا استاد۔ ہر ایک کو برتن خود اپنے ہاتھ سے دھو کر تولیے سے خشک کر کے اپنی جگہ پر رکھنے ہوتے ہیں۔ ایک برس [illegible] یہاں آئے تھے۔ اس تقریب کو ہر سال اسی طرح منایا جاتا ہے کہ اس دن



© rasailojaraid.com